اللہ کی طرف محبت کے ساتھ میلان کے نتیجے میں انسان کے دل سے بے قرار دعائیں پھوٹا کرتی ہیں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 14 رفروری 1997ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰي مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۸﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۹﴾ (الزمر: 54 تا 59)

پھر فرمایا:

ان آیات سے متعلق جو خطاب مجھے آپ سے کرنا ہے اس سے پہلے میں ایک دو اور امور کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔ گزشتہ عید کے روز جو میں نے اپنی بچی عزیزہ طوبیٰ کا نکاح پڑھایا تھا اس

میں بننے والے دولہا بشیر احمد کے نانا حضرت نواب محمد عبداللہ خان صاحب سے متعلق بات کرتے ہوئے میں نے کہا تھا مجھے یقینی طور پر یاد نہیں کہ آپ صحابی ہیں، یہ تو قطعی طور پر علم تھا کہ آپ صحابہ کی عمر کے تھے یعنی اگر آپ کی رویت ہو جاتی اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آپ دیکھ لیتے اور آپ ان کو دیکھ لیتے تو صحابی بن سکتے تھے کیونکہ حضرت پھوپھی جان سے آپ کی عمر کا کافی فرق تھا اور حضرت پھوپھی جان کی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے وقت چار سال عمر تھی تو ظاہر ہے کہ صحابیت کی عمر تو تھی اور امکان موجود تھا لیکن مجھے قطعی طور پر یاد نہیں تھا کہ آپ کو قادیان آ کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت ملی بھی کہ نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بعض صحابہؓ کے متعلق میں بیان کر چکا ہوں، عمر تو رہی مگر صحابیت کی توفیق نہیں ملی۔ اس سلسلے میں مولوی دوست محمد صاحب نے جیسا کہ میں نے ہدایت دی تھی کہ مجھے فوری طور پر اطلاع بھیجی جائے، واقعات دیکھ کر انہوں نے جو تحریری اطلاع کی ہے وہ کہتے ہیں کہ نواب محمد عبداللہ خان صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دسمبر 1959ء کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا خط غالباً اس شعبہ کو بھیجا ہے جس نے صحابہؓ کا ریکارڈ رکھنا ہوتا ہے اس میں ان کی تحریر یہ ہے ''میں اس سیر میں بھی تھا جس میں حضور علیہ السلام کے ساتھ سات سو افراد سیر کے لئے جلسے کے موقع پر گئے تھے۔ ریتی چھلے میں ایک لسوڑھے کا درخت تھا، حضور اس کے نیچے ٹھہرے اور فرمانے لگے کہ اب اس قدر احباب کی تعداد ہے کہ چلا نہیں جاتا، غالباً یہ آخری جلسہ سالانہ حضورؑ کے زمانے کا تھا۔'' پس معیت بھی نصیب ہوئی اور واقعہ پوری طرح یاد تھا اس لئے آپ کو صحابہ میں شمار کرنے میں کوئی بھی تردد نہیں ہونا چاہئے۔ پس آپؓ صحابہؓ ہی میں شامل تھے اس لئے اب ان کے متعلق میں نے رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعا ساتھ شامل کر دی ہے۔

اسی طرح ایک اور حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کا حوالہ بھی بھیجا ہے وہ لکھتے ہیں ''اخویم نوابزادہ میاں عبداللہ خان صاحبؓ، حضرت نواب محمد علی خان صاحبؓ کے فرزند ہونے کی وجہ سے صحابیؓ ابن صحابیؓ تھے۔'' یعنی صحابیت کی گواہی تو دی، ساتھ لیکن یہ زائد بات کہی کہ آپ صحابیؓ ابن صحابیؓ تھے۔

ایک امر تصحیح طلب ان معنوں میں ہے کہ تاریخی نقطہ نگاہ سے ایک غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے جسے دور کرنا ضروری ہے۔ مکرم امیر صاحب جماعت احمدیہ کراچی رحمہ اللہ کے وصال پر میں نے بیان کیا

تھا کہ آپ چوہدری محمد عبداللہ خان صاحب کے بعد امیر ہوئے اور اس لحاظ سے بڑی بھاری ذمہ داری تھی جو اسی معیار پہ جماعت کو رکھنا تھا جس معیار پہ وہ چھوڑ گئے تھے۔ اس سلسلہ میں غلطی اس لئے ہوئی کہ کراچی جماعت کی طرف سے جو اعداد و شمار آئے اس میں بیچ کے زمانے میں حضرت چوہدری عبداللہ خاں صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال کے بعد مکرم چوہدری احمد مختار صاحب کے امیر بننے تک کا درمیانی جو عرصہ ہے اس کا ذکر ہی کوئی نہیں تھا اور وہیں سے بات شروع کی تھی اس لئے وہ باوجود اس کے کہ مجھے علم تھا مگر اس وقت فوری طور پر ذہن میں یہ بات نہیں آئی اور جو اعداد و شمار جس طرح آئے تھے اسی طرح پیش کر دیئے اور تاثر یہ دیا کہ گویا چوہدری عبداللہ خاں صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال کے فوراً بعد چوہدری احمد مختار صاحب امیر بنے تھے، یہ درست نہیں ہے۔ چوہدری عبداللہ خاں صاحبؓ کا وصال 1959ء میں ہوا ہے اور 1959ء سے 1965ء تک حضرت مصلح موعودؓ کے زمانے میں شیخ رحمت اللہ صاحب امیر جماعت کراچی رہے ہیں اور باقاعدہ منتخب ہوئے۔ اور پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے زمانے میں پھر جو انتخاب ہوا ہے اس میں چوہدری احمد مختار صاحب امیر منتخب ہوئے۔ وہ جو پچھلا دور ہے اس سے پہلے بھی شیخ صاحب کو رسمی طور پر بھی امارت کے فرائض ادا کرنے کی توفیق ملی تھی، رسمی طور پر ان معنوں میں کہ عملاً چوہدری عبداللہ خاں صاحب ہی امیر رہے ہیں لیکن امارت کے نام کے طور پر شیخ صاحب کو باقاعدہ امیر کے طور پر لکھا گیا۔ اس کی حکمت یہ تھی کہ 53ء، 54ء میں جو حالات تھے وہ بہت سنگینی اختیار کر گئے تھے اور چوہدری عبداللہ خاں صاحب کے چوہدری ظفر اللہ خاں صاحبؓ کے بھائی ہونے کی حیثیت سے اور حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے آپ کے معاملات میں حکومت کی دخل اندازی کا زیادہ احتمال تھا اور اس بناء پر آپ کو خدمت سے بھی الگ کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس سے پہلے ایک باقاعدہ صدر کا فیصلہ جاری کیا جا چکا تھا کہ کوئی بھی اعلیٰ عہدے کا ملازم، کوئی دینی مناصب پر نہیں ہوگا، اس قسم کا کچھ حکم تھا جو اس کے الفاظ تو یاد نہیں مگر اس حکم کے تابع ان کی حفاظت کی خاطر مکرم شیخ رحمت اللہ صاحب کو حضرت مصلح موعودؓ نے امیر مقرر کیا اور بحیثیت امیر حکم وہی جاری کرتے تھے، عملاً وہی ساری باتیں کہتے تھے، مگر جو ادب کا تقاضا تھا اس کے پیش نظر چوہدری صاحبؓ کے مشورے پر ہی چلتے تھے اور اس طرح ایک زائد فرائض

انجام دینے کی حیثیت سے امیر بھی رہے اور عملاً چوہدری عبداللہ خاں صاحب معزول نہیں ہوئے بلکہ ان کا مشورہ جاری رہا۔ یہ حقیقت ہے جو تاریخی حقیقت ہے اسے درست کرنا ضروری تھا۔ چونکہ میرے خطبہ سے غلط تاثر پڑ سکتا تھا اس لئے مجھے وضاحت سے بات پیش کرنی پڑی۔

اب میں ان آیات کی طرف آتا ہوں قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ رمضان گزرا ہے اس میں بہت موقع ملا جماعت کو توبہ کا، استغفار کا، گناہ جھاڑنے کا، اپنے نفوس کے وضو کا اور ان کے غسل کا بھی اور بہت ہی خوش نصیب ہیں وہ جو رمضان سے دھل کے پاک صاف ہو کر نکلے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ضرور ہوں گے، کیونکہ سو فیصدی قوم کی اصلاح تو ممکن ہی نہیں ہے کوئی نبی ایسا نہیں جس کے زمانے میں کسی قوم کی اس کی زندگی ہی میں سو فیصدی اصلاح ہو چکی ہو اس لئے جاری جدوجہد ہے، ایک جہاد ہے جس میں ہم نے ہمیشہ مصروف رہنا ہے۔ جب تک خدا کا بلاوا نہ آجائے ہم نے لازماً جدوجہد کرنی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ایسا خوش نصیب ہو جائے کہ مرنے سے پہلے وہ ابرار میں لکھا جائے اور اس کے تمام گناہ بخشے جا چکے ہوں۔ اس تعلق میں یہ آیت ہے جو ایک خوشخبری لے کر آئی ہے اور ایک تنبیہ بھی لے کر آئی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اے وہ لوگو جنہوں نے اپنے نفوس پر اسراف کیا ہے۔ یہاں عام گناہ مراد نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے ترجمہ میں فرماتے ہیں یعنی گناہ کبائر میں ملوث ہوئے ہیں۔ جو بڑے سے بڑے گناہ ہیں وہ بھی کر بیٹھے ہیں لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا یقیناً اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخشنے کی طاقت رکھتا ہے اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ یقیناً وہی تو ہے جو بہت بخشنے والا اور بار بار رحم فرمانے والا ہے۔

اس آیت کے نتیجے میں جو یہ احساس ہوتا ہے ایک عام معافی کا اعلان ہے، ہر گناہ گار بخشا گیا، یہ احساس غلط ہے۔ درست نہیں ہے کیونکہ بخشے جانے کے امکان کے دروازے کھولے گئے ہیں، ہر شخص کے بخشے جانے کا اعلان نہیں ہوا۔ اس لئے بعض صوفیاء یا صوفیاء مزاج لوگ یہ سمجھتے ہیں بس یہ آیت ہوگئی اب ہمیں کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ سب کبائر بھی بخشے گئے، سب صغائر بھی بخشے

گئے، اللہ بہت غفور رحیم ہے۔ جب گناہوں سے باز رکھنے کے لئے ان کو متوجہ کیا جاتا ہے (تو کہتے ہیں) اللہ بڑا غفور ورحیم ہے ہر گناہ بخش دے گا۔ پس یہ جو غلط تاثر ہے اس کو اگلی آیات بہت وضاحت سے دور کر رہی ہیں، بہت ہی صفائی کے ساتھ ایک ایک پہلو اس کا، اس غلط تاثر کا رد فرما رہی ہے۔

چنانچہ فرمایا غفور رحیم ہے تو کیا کرو وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ پس اپنے رب کی طرف جھک جاؤ اس کی طرف مائل ہو جاؤ۔ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دو مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ اس سے پہلے کہ عذاب تم تک آ جائے اور پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ تو اگر بخشش کا عام اعلان تھا تو معاً بعد اس آیت کا پھر کیا موقع ہے کہ جلدی خدا کی طرف جھکو اس وقت سے پہلے کہ عذاب تم تک آ پہنچے اور پھر بخشش کا وقت گزر چکا ہو۔ پھر فرمایا وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ پھر فرمایا ہے وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ یعنی اللہ کی طرف بڑھو اور جھک جاؤ تا کہ تمہارے گناہ بخشے جائیں تم نیکوکاروں میں شمار ہو لیکن یہ ایک مقام اور ایک مرتبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بہتر تو ہے کہ عذاب سے پہلے اس سے بلند تر مرتبہ حاصل کر لو اور وہ یہ ہے وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ جو بھی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں جو بھی ہدایات تمہیں دی گئی ہیں ان میں سے ادنیٰ پر راضی نہ رہو بلکہ توبہ کے ساتھ اعلیٰ پر ہاتھ مارو۔ جو سب سے خوبصورت حصہ تعلیم کا ہے جو سب سے اعلیٰ درجے کا ہے اسے اپناؤ اور اسے اپنی ذات میں جاری کرنے کی کوشش کرو۔ پھر فرمایا مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ پہلے یہ تھا تُنْصَرُوْنَ اب اس آیت میں ہے تَشْعُرُوْنَ۔ تَشْعُرُوْنَ کا مضمون بتا رہا ہے کہ ایسا عذاب جس کے آثار ظاہر نہ ہوں اور اچانک آ جائے۔ یہاں لَا تُنْصَرُوْنَ نہیں فرمایا کیونکہ لَا تُنْصَرُوْنَ کا مضمون یہاں اطلاق پاتا ہی نہیں۔ پہلی آیت نے اس کو خوب کھول دیا کہ اگر اللہ کی طرف انابت نصیب ہو جائے تو پھر تمہیں مدد دی جائے گی۔ تم اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ اس کی رحمت، اس کی مغفرت کے سائے تلے آ جاؤ گے، تمہارے گناہ بخشے جائیں گے۔ اگر عذاب آنے کے وقت تم نے توبہ کی تو وہ توبہ رد کر دی جائے گی پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔

مگر جہاں فرمایا اَحْسَنَ وہاں لَا تَشْعُرُوْنَ والے عذاب کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ لوگ جو توبہ کر لیتے ہیں لیکن نیک اعمال میں جو بہترین اعمال ہیں انہیں

اختیار کرنے میں کوئی جلدی نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں یہ اوپر کی باتیں ہیں ہم بعد میں کرلیں گے پہلے ابتدائی تو ٹھیک کرلیں اپنے آپ کو، نمازیں شروع کردی ہیں بس یہی کافی ہے۔ انہیں سنوار کر پڑھنا، تہجد کی نمازوں تک جا پہنچنا، راتوں کو اٹھنا ان تمام تقاضوں کو وہ سمجھتے ہیں کہ نفلی اور نسبتاً زیادہ اعلیٰ درجے کے تقاضے ہیں ان کے بغیر بھی کام ہوسکتا ہے اس لئے وہ نفس کی کمزوری کی وجہ سے ٹالتے چلے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بڑھ ہی رہے ہیں، آج نہیں تو کل حاصل کرلیں گے یہ باتیں۔ تو اس کی طرف اللہ تعالیٰ متوجہ فرما رہا ہے کہ جو اَحْسَنَ کا حاصل کرنا ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔ پہلی بات سے تمہیں تقویٰ تو نصیب ہو جائے گا مگر ادنیٰ درجے کا تقویٰ اور جب تم توبہ کے بعد بہترین حصے پر عمل کی کوشش کرو گے تو تمہارے وجود کی کایا پلٹ جائے گی اور اس سے پہلے کہ خدا کی کوئی پکڑ ظاہر ہو جائے جسے تم محسوس نہ کرو یعنی تمہارا موت کا وقت آپہنچے یا عذاب عام ظاہر ہو جائے اس وقت سے پہلے پہلے تم بہترین عمل کرلو۔

اب یہاں ایک مشکل ہے جس کا دور کرنا ضروری ہے۔ وہ لوگ جو توبہ کر لیتے ہیں کیا جب عذاب کا وقت آتا ہے اگر وہ احسن پر ہاتھ نہ ڈال رہے ہوں تو کیا عذاب کے نیچے آئیں گے؟ یہ سوال پیدا ہوتا ہے ورنہ آیت کریمہ ایک غیر ضروری بات تو نہیں فرما سکتی۔ پہلی آیت کے ساتھ اس کو ملا کر پڑھیں تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ اَنِیْبُوْٓا کا مطلب تھا اگر تم توبہ کرلو خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ، خدا نے وعدہ فرما دیا کہ پھر عام بخشش کے اندر تم داخل ہو جاؤ گے تو احسنوا اس سے اگلا قدم ہے اگر احسان نہ کر سکے تو کیا اچانک عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ ہے جو مشکل اس سے پیدا ہوتی ہے اور دور کرنا ضروری ہے۔ عذاب کی جو نوعیت ہے بَغْتَةً اور اچانک یہ بعض دفعہ قومی عذاب کے طور پر نازل ہوا کرتا ہے جس میں نیک بھی جس طرح گندم کے دانوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے اسی طرح وہ ہر شخص بیچ میں کچھ نہ کچھ مبتلا ضرور ہو جاتا ہے۔ عام قومی عذاب آرہے ہیں، مصیبتیں پڑ رہی ہیں سیلاب آرہے ہیں، طوفان آرہے ہیں، بے اطمینانی ہو رہی ہے، گھر گھر ڈاکے پڑ رہے ہیں، بچے اغوا ہو رہے ہیں، ہر طرف ظلم کا دور دورہ ہے۔ وہ جو عذاب ہے وہ آتا تو بدوں پر ہے اور بد ہی اس کے ذمہ دار ہیں لیکن بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ نیک لوگ بھی بے چارے اس میں زخمی ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی پہلو سے وہ دکھ اٹھا لیتے ہیں اور بعض دفعہ اچانک جو طوفان ظاہر ہوتا ہے مثلاً سیلاب آ گیا ہے وہ نیکوں کے گھر اور بروں کے گھروں میں تمیز تو نہیں کرتا مگر وہ لوگ جو خدا کے نزدیک احسن اعمال

والے ہیں ان کی بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اس حیرت انگیز طریق پر حفاظت فرماتا ہے کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس طرح ہم بچائے جائیں گے۔

چنانچہ پاکستان میں جو بداطمینانی کی حالت ہے اس میں کئی دفعہ بعض نیک لوگ بھی بتاتے ہیں کہ ہم بھی مشکل میں مبتلا ہوئے، ہمیں بھی ڈاکوؤں نے لوٹا، ہمارے گھر بھی داخل ہوئے لیکن ایک بات تو یہ نظر آتی ہے کہ اس اگلی بدحالت سے وہ پھر بھی بچا لیے گئے ہیں جو بعض دوسروں کے اوپر عائد کی گئی۔ یعنی عورتوں کی بے عزتی، بچوں پر ظلم وستم اور کسی طرح ان ڈاکوؤں کے ہاتھ رک گئے اور وہ آخری حد تک نہیں پہنچے۔ یہ تو عام خدا تعالیٰ کا ایک خاص فضل ہے جو جماعت پر دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے متعلق کوئی وجہ ہی نہیں نظر آتی کہ کیوں بچ گئے، حالات نے گھیرا ڈال لیا تھا، ان کا بچنا دکھائی نہیں دیتا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ اس طرح خدا تعالیٰ کے فضل کے ہاتھ نے ہمیں بچا لیا کہ حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ وہ احسان والے لوگ ہیں جن کو بَغْتَةً عذاب بھی نہیں چھوئے گا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ سیلاب سے ایک دن پہلے وہاں سے منتقل ہو گئے ہیں یا اور ایسا ذریعہ بن گیا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو وہاں سے بچا لیا اور نقصان سے بچا لیا تو احسن عمل محض ایک نفلی حصہ نہیں ہے بلکہ روزمرہ کی زندگی کی ضرورتوں میں داخل ہے اور احسن عمل والا اس نیک سے زیادہ بہتر جزا پاتا ہے جو عام باتوں میں تقویٰ تو اختیار کرتا ہے یعنی بدیوں سے بچ جاتا ہے مگر نیکیوں میں آگے نہیں بڑھتا اور لفظ اَحْسَنَ کا استعمال اس پہلو سے قرآن کریم نے اور بھی جگہ فرمایا ہے اور فرمایا ہے جنہوں نے اس دنیا میں احسان سے کام لیا، جو محسن ہو گئے ان کے لئے اس دنیا میں غیر معمولی جزاء ہے اور یہاں بھی جزاء ہوگی۔

تو اس پہلو سے اگر آپ رمضان کے بعد اپنی بدیوں کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہیں اور متوجہ رہنا چاہتے ہیں اور رمضان گزرنے کے بعد اسے الوداع نہیں کہہ بیٹھے تو پھر اس طرح سے اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔ سب سے پہلے انابت ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف طبیعت کا جھکاؤ اور میلان۔ یہ جو انابت ہے یہ جھکاؤ ایسا ہے جو اپنی ذات میں بخشش کے لئے ایک لازمہ ہے۔ جس شخص کا اللہ تعالیٰ کی طرف رجحان نہ ہو اس پر اس آیت کا کوئی اطلاق نہیں ہوگا کہ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔ بڑا ہی بیوقوف ہوگا جو یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف میرا میلان ہی کوئی نہیں، رجحان ہی کوئی نہیں، میں مزے سے دنیا میں مبتلا رہوں گا اور بخشا جاؤں گا۔ بڑے دھوکے میں مبتلا ہے۔ یہ دنیا بھی اس کی اکارت جائے گی اور اگلی دنیا بھی۔

پس اَنِیْبُوْٓا کی شرط ہے جو توبہ کے لئے آغاز کا کام دیتی ہے۔اس شرط کا مطلب ہے کہ تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کا اتنا خیال تو ہو کہ اس کی طرف جھکنے کی طرف طبیعت مائل ہو، دل چاہنے لگے کہ میں اللہ والا ہو جاؤں۔ جب نیت کے اندر یہ آغاز ہوتا ہے نیکی کی طرف قدم بڑھانے کا تو انابت سے ہوا کرتا ہے ورنہ جو گناہوں میں ملوث ہیں ان کو گناہوں کا مزہ اتنا بڑھتا جاتا ہے کہ وہ گناہوں سے توبہ کا خیال بھی نہیں کرتے بلکہ ان گناہوں کی حسرت کیا کرتے ہیں جو کر نہیں سکے۔تو جو اصل تبدیلی والی بات ہے وہ انابت ہے۔یعنی خدا تعالیٰ کی طرف طبعی میلان اور جھکاؤ۔تو فرمایا کہ اگر تم مغفرت کے اس اعلان عام سے متاثر ہوئے ہو، تم چاہتے ہو کہ تم بھی اس مغفرت کی لپیٹ میں آجاؤ، اس کے سائے تلے آجاؤ اَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ اپنے رب کی طرف میلان پیدا کرو اس کی طرف جھکو اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف پیار کا میلان ہوگا تو پھر خدا تعالیٰ تمہارے اندر تبدیلیاں پیدا کرے گا ورنہ خالی باہر بیٹھے خدا سے تعلق کوئی نہ ہو، توبہ توبہ کرتے رہو کچھ بھی اس توبہ کے معنے نہیں ہیں۔

جب انابت ہوگی تو پھر اس سے اگلا قدم اٹھانے کی توفیق ملے گی وَ اَسْلِمُوْا لَہٗ اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دو۔اگر پیار نہیں ہے محبت نہیں ہے تو انسان سپرد کیسے کر سکتا ہے یہ تو ناممکن ہے۔انسان اپنے آپ کو اسی کے سپرد کیا کرتا ہے جس سے محبت ہو جائے۔تو اَنِیْبُوْٓا میں جو محبت کا مضمون ہے وہ کھول کر بیان کرنا ضروری تھا محبت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکو اور اس کے سپرد اپنے آپ کو کرتے چلے جاؤ اور سپردگی میں مغفرت کا مضمون ایک نئی شان کے ساتھ داخل ہے۔سپردگی اس موقع پر یہ معنی رکھتی ہے کہ تم اپنی طاقت سے تو اپنے گناہ جھاڑ نہیں سکتے اپنی طاقت سے تو اپنی برائیاں دور نہیں کر سکتے اللہ سے پیار پیدا ہو گیا ہے مگر گناہ دور کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اَسْلِمُوْا ان معنوں میں کہ اللہ کو کہو ہم تو تیرے ہو گئے ہیں تیرے سپرد اپنے آپ کو کر رہے ہیں اب تو ہی ہے جو ہماری مغفرت کا سامان فرمائے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ وہی مضمون ہے جو ایک اور رنگ میں بیان ہوا۔ہم نے جب فیصلہ کر لیا ہے کہ تیری عبادت کریں گے اور تیرے سوا کسی کی نہیں کریں گے تو بڑا مشکل کام ہے۔فیصلہ بہت عظیم ہے مگر اس فیصلے پر عمل مشکل ہے۔اس لئے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں تو جس کے ہو گئے یا جس کے لئے دل میں ایک میلان پیدا ہوا اس کے سپرد ہونے کے لئے بھی اسی کی حفاظت کی چادر میں آنا اَسْلِمُوْا کا مضمون ہے۔تم اپنے معاملات اس کے سپرد کرتے

چلے جاؤ۔ پس یہ ایک وسیع انسانی تجربہ ہے کہ وہ لوگ جو گناہ سے دور ہٹنے کا ارادہ کرتے ہیں کوشش کرتے ہیں طاقت نہیں پاتے، اگر وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور خدا کی محبت کے واسطے دے کر گریہ و زاری کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں کہ اے اللہ ہم کیا کریں ہمیں گناہ نے گھیر لیا ہے، بے اختیاری کا عالم ہے، ہم اپنا معاملہ تیرے سپرد کرتے ہیں تو جس طرح چاہے ہمیں پاک صاف کرے ایسے لوگوں کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ ناممکن ہے کہ غیبی ہاتھ ان کے گناہوں کو صاف نہ کرنا شروع کرے۔

پس اَسْلِمُوْا میں وہ سپردگی نہیں ہے جو احسان بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک معنی رکھتی ہے۔ وہ سپردگی جو حضرت ابراہیمؑ کو نصیب ہوئی جن کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (البقرۃ: 132) اپنے آپ کو سپرد کر دو انہوں نے کہا میں تو ہو چکا ہوں تیرا سارا کا سارا۔ وہ گناہوں سے بچنے والا مضمون نہیں، یہاں گناہوں سے بچنے والا مضمون ہے۔ اس لئے موقع محل کے مطابق اَسْلِمُوْا کے معنی کئے جائیں گے۔ اپنے معاملات اللہ کے حوالے کرو مگر دیانت داری اور خلوص کے ساتھ۔ اس کی محبت کے نتیجے میں، اپنی بے اختیاری اپنی بے بسی کو اس کے حضور پیش کرتے ہوئے کہہ دو اب ہم تیرے ہو گئے ہیں:

سپردم بہ تو مایہء خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را (بنام ایزد بخشایندہ شرف نامہ نظامی از حکیم نظامی گنجوی)

یہ وہ مضمون ہے جو یہاں اَسْلِمُوْا میں بیان ہوا کہ اے اللہ ہم نے تو اپنا سارا معاملہ تیرے حوالے کر دیا ''**تو دانی حساب کم و بیش را**'' تو جانتا ہے کہ کم کیا ہے اور زیادہ کیا ہے۔ ہم سے تو اس سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا۔ جو تھا وہ تیرے حضور حاضر کرتے ہیں۔

تو اس طرح جو بخشش ہے وہ اللہ تعالیٰ کی سپردگی میں ہوتی ہے، اس کی حفاظت میں ہوتی ہے، اس کی طاقت کے تابع ہوتی ہے، اس کی طاقت کے سہارے ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو پھر عذاب میں تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ عذاب سے کلیۃً بچانے کا مضمون نہیں ہے یہاں۔ کسی بھی تکلیف میں تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ مگر اگر تم تقویٰ کا یہ معیار قائم کر لو گے اس معیار پر پورے اترو گے تو عذاب آئے گا بھی تو ہم تمہیں ضرور مدد دیں گے اور یہ وعدہ جو ہے یہ ایک عام وعدہ ہے جو بلا استثناء ہمیشہ ان مسلمانوں

کے حق میں جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں ضرور پورا کیا جاتا ہے۔ پس جماعت احمدیہ اس سے استفادہ کرے۔

یہ زمانہ تکلیفوں کا اور عذابوں کا زمانہ ہے۔ سب دنیا میں بے چینی پھیل گئی ہے۔ ہر جگہ سے امن اٹھ رہا ہے۔ طرح طرح کی مشکلات درپیش ہیں۔ وہ امراض جو پہلے دب گئی تھیں وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی ہیں یعنی بدنی امراض بھی اور اخلاقی امراض بھی اور تمدنی امراض بھی۔ اب دیکھیں یہاں جس طرح قومی تعصّبات کا بھوت سر اٹھا رہا ہے چند سال پہلے اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہر قوم میں بے چینی ہے، ایک بیقراری ہے۔ اس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں کہ معصوموں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور عجیب انداز ہے اس زمانے کا کہ ہر وہ چیز جو انہیں بے چین کرتی ہے اس کے نتیجے میں دوسروں کو اور بھی زیادہ بے چین کر دیتے ہیں۔ اسی زمانے کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے گھاٹے کا زمانہ ہے نقصان کا زمانہ۔ جو عمل کرو ٹیڑھا کرو، جو بات کرو الٹی کرو۔ تو اس زمانے میں اگر بچنا ہے تو اَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ کے ذریعے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اس کی محبت کا آغاز کر دیں یعنی ایک دم تو ساری، تمام تر محبت اللہ تعالیٰ سے نہیں ہو سکتی۔ اس کا خیال دل میں آنا شروع ہو جائے، یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو جائے کہ اللہ کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ خلا محسوس ہو کہ ہمیں خدا تعالیٰ کی جو محبت محسوس ہونی چاہئے تھی وہ محسوس نہیں ہو رہی۔ نمازیں خالی ہیں، ذکر خالی ہے دن رات دنیا کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، لیکن بار بار دھیان اللہ کی طرف نہیں جاتا۔ اس مرض کو دور کریں اور اللہ تعالیٰ کا پیار پیدا کرنے کی کوشش کریں یعنی اس حد تک کم سے کم اتنا پیار کہ دل مائل تو ہو، یاد تو آئے خدا۔ جب یاد آئے تو پھر اس حوالے سے اپنے نقائص کو دور کرنے کے لئے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنا شروع کر دیں۔ اللہ میاں! تو پاک ہے، تو اعلیٰ ہے، تو ارفع ہے، تو عظیم ہے، ہم تو جب غور کرتے ہیں، ہم لگتا ہے کہ تیرے قابل ہی نہیں ہیں۔ کیا کریں مگر دل چاہتا ہے کہ تیرے قابل ہو جائیں اس پہلو سے تو ہم پر رحم فرما اور ہمیں سنبھال لے تو اَسْلِمُوْا کا مضمون یہاں سنبھالنے کے معنوں میں ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ جب تم سنبھالے جاؤ گے تو پھر اگلا قدم ضرور اٹھانا۔ جو ابتدائی نیکیاں تمہیں نصیب ہیں ان پر بیٹھ نہ رہنا، ان پر تسلی نہ پا جانا کیونکہ

نیکیوں کی راہ تو ایک لامتناہی آگے بڑھنے والی راہ ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف مسلسل حرکت ہے جو حقیقی حسن پیدا کرتی ہے۔ چند باتیں حاصل کر کے، چند بدیوں سے بچ کر تم حقیقت میں نیک انجام کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اس راہ میں اگلے قدم نہ اٹھاؤ، اگلی منزلیں بھی طے نہ کرو اور وہ احسان کی منازل ہیں۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت جس میں درجہ بدرجہ مستقل احسان کی طرف سفر کا ذکر ہے میں پہلے بھی ایک خطبے میں روشنی ڈال چکا ہوں۔ پس اس میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا مگر یاد رکھیں کہ احسان والی جو منزل ہے وہ آپ کو ایسے عذاب سے بھی بچائے گی جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

تُنْصَرُوْنَ اور اس میں یہ فرق ہے اگر عذاب ایسا آئے کہ ابھی زندہ ہو انسان، ہوش میں ہو مدد مانگ سکتا ہو تب ہی اس کی مدد کی جائے گی نا۔ لیکن یہ ایسا عذاب جس کا پتا ہی نہ چلے، آئے اور آپ کو کالعدم کر دے، بھسم کر دے اگر وہ آگ کا عذاب ہے، اگر سیلاب کا عذاب ہے تو غرق کر دے اس وقت آپ کیا مدد مانگیں گے۔ اگر سوتے میں ایسا واقعہ ہو جائے اور اتنا اچانک ہو کہ ہوش بھی نہ رہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ جو احسان کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں ان کو خدا تعالیٰ کی خوشخبری ہے ان کو ایسے عذاب کی اچانک پہنچنے والی تکلیفوں سے بھی بچایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا۔ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر حسرت کے سوا تمہارا کوئی انجام نہیں۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو جن کو مغفرت نصیب ہونی ہے ان میں تم شامل نہیں ہو یہ اعلان ہو رہا ہے۔ اور حسرت یہ ہوگی مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ میں نے جو جو کوتاہیاں کی ہیں، جن فرائض سے غافل رہا ہوں اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کے ساتھ ہوتے ہوئے اس کے پہلو میں زندگی بسر کرتے ہوئے وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ میں تو السّٰخِرِيْنَ میں سے رہا۔ اب ساخر کا ایک معنی ہے تمسخر کرنے والا، مذاق کرنے والا۔ اس موقع پر وہ چسپاں نہیں ہوتا۔ ساخر کا ایک مطلب ہے کسی چیز کو معمولی سمجھنا اور اس کو وقعت نہ دینا اور یہی معنیٰ ہے جو اس موقع پر چسپاں ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مصلح موعودؓ کا ترجمہ میں نے اسی نیت سے دیکھا تو اس میں یہ لکھا ہوا ہے ساخرون والی آیت کا یہ ترجمہ ہے تا ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ جو کچھ اللہ کے بارے میں میں نے کمی کی ہے اس کی بناء پر مجھ پر افسوس ہے اور میں تو وحی الٰہی کو حقیر سمجھتا رہا۔ ساخرین کا ترجمہ آپؓ نے حقیر ہی فرمایا ہے مگر وحی الٰہی کو بریکٹ میں رکھا ہے یعنی ایک معنی

اس کا یہ ہے۔ ساخرین کا تعلق لازم نہیں کہ وحی الٰہی سے ہو، ساخرین کا ایک تعلق عام روزمرہ کے معاملات میں اصلاح کی طرف متوجہ ہونے سے بھی ہے اور ساخرین ان معنوں میں وہ تمسخر والے معنی بھی رکھتے ہیں کہ ہنس کھیل کر ہم نے دنیا کو چھوڑا۔ ان باتوں کو، دین کی باتوں کو معمولی سمجھا اور ہنسی ٹھٹھے میں وقت ضائع کر دیا کوئی اہمیت نہ دی دین کی باتوں کو۔ اب جب وقت آ گیا عذاب کا اب اس سے بچ نہیں سکتے۔ یہ جو عمومی مضمون ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ پہلی دونوں آیات کی طرف ایک کے بعد دوسری کی طرف توجہ دیتا ہے اسی ترتیب کے ساتھ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ یا اس وقت یہ کہو کہ کاش مجھے اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی ہوتی تو میں متقین میں سے ہو جاتا یعنی بچ جاتا برائیوں سے۔ اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ تو پہلی آیت کا مضمون میں نے تقویٰ سے جو باندھا تھا قرآن کریم اس کو درست ثابت فرما رہا ہے اور دوسری آیت کے مضمون کو جو میں نے تقویٰ کے بعد بلند تر مناصب کی طرف بڑھنے کے لئے بیان کیا تھا یہ آیت بعینہٖ اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ اسی ترتیب کے ساتھ قرآن کریم اس مضمون کو ختم کرتا ہے کہ دیکھو پہلے پہلے ہدایت پا جاؤ ورنہ یہ حسرت رہے گی کہ کاش میں تقویٰ اختیار کر لیتا اور اس عذاب کے بعد چونکہ تقویٰ کی طرف لوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی یہ اس طرف اشارہ ہے۔ جب خدا کی پکڑ آ جائے پھر اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا والی بات ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ پھر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی بات نہیں اللہ مجھے بخش دے گا۔ اس وقت سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کاش اس وقت سے پہلے پہلے میں تقویٰ اختیار کر چکا ہوتا اور امن میں آ جاتا اور پھر فرمایا اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ اچانک عذاب دیکھ کے پھر یہ نہ کہنا کہ کاش میں اتنا نیک ہوتا اس سے پہلے کہ احسان کی منازل بھی طے کر چکا ہوتا۔ تو بعض دفعہ عذاب کے وقت محض توبہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی بلکہ اور بھی زیادہ بلند مراتب کو حاصل کرنے کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو ان مراتب کو حاصل کرتے ہیں وہ یاد آ جاتے ہیں اور انسان سمجھتا ہے کہ او ہو میری زندگی میں وہ بھی تو تھا، وہ بھی تو تھا، کیسے اعلیٰ پائے کے لوگ تھے۔ کس طرح انہوں نے خدا کے حضور رکوع اور سجود میں زندگیاں گزاریں کس طرح خدا کی عبادتیں کیں۔ کس طرح خدا کے معاملات میں انہوں

نے اپنے آپ کو حسین تر بنایا یعنی محسنین ان معنوں میں بنے اور بندوں کے معاملات میں ان کا سلوک حسین سے حسین تر ہوتا چلا گیا۔ وہ محض عدل پر قائم نہ رہے بلکہ احسان کا سلوک کرنے لگے یہ جو حسرتیں ہیں یہ جب آئیں گی تو پھر یہ وقت نہیں رہے گا۔

پس یہ امور ہیں جن کی طرف توجہ کرنی لازم ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے لئے لازم ہے۔ موت آج نہیں تو کل آنی ہی آنی ہے کوئی اس سے بچ نہیں سکتا اور ساخرین والی بات پھر پیدا نہ ہو۔ موت کے وقت یہ حسرت نہ لئے بیٹھے ہوں۔ عذاب سے مراد صرف وہ ظاہری عذاب جو ہیں وہ نہیں ہیں بلکہ جو طرز بیان ہے اس میں موت کا وقت بھی داخل ہے۔ پس جب موت آجائے گی تو لاکھ زور ماریں آپ، واپس ہو ہی نہیں سکتی۔ اس وقت کی حسرتیں کسی کام نہیں آئیں گی اور بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مرتے وقت اس نے توبہ کر لی تھی اس لئے ٹھیک ہے، یہ وہم ہے۔ فرعون نے بھی تو مرتے وقت توبہ کی تھی، کب خدا نے اس کی طرف توجہ دی۔ اس کی اس توبہ کو رد کر دیا ہاں اسے عبرت کا نشان بنانے کے لئے وعدہ کیا کہ ہم تیرے جسم کو رکھیں گے۔ تو ایسی حالت تک نہیں پہنچنا اور چونکہ اچانک آئے گی موت یا بعض عذاب بھی اچانک آجاتے ہیں اس لئے پتا ہی کچھ نہیں کب آجائے۔ اس سے پہلے پہلے وقت ہے کچھ کرنا ہے تو کر لو اور یہ زندگی عارضی ہے۔ دن جو لمبے بھی دکھائی دیں وہ بھی گزر ہی جاتے ہیں بعض لوگوں کو رمضان بڑا لمبا دکھائی دیتا تھا کہ ایک مہینہ گزرے گا پورا اور گزر ہی گیا۔ دیکھتے دیکھتے اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (البقرۃ:204) ہی ہو جاتے ہیں۔ جب وقت ٹل جائے، گزر جائے تو اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ گزرا ہوا وقت ہمیشہ چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے تبھی قیامت کے بعد لوگ کہیں گے ہم تو ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ رہے اس سے زیادہ تو ہمیں کچھ نہیں ملا۔

تو وقت تو گزرنا ہے اور یہ زندگی لازماً گزر جائے گی آج نہیں تو کل گزر جائے گی۔ کل نہیں تو پرسوں، ہزار سال بھی رہیں تب بھی گزرنی ہی گزرنی ہے اور وہ وقت آجائے گا جس وقت کے بعد پھر کوئی پیچھے ہٹنا نہیں ہے سوائے حسرتوں کے کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے زندگی میں جب تک توفیق ہے توبہ کرو، استغفار کرو اور قرآن کریم نے دیکھو کتنا آسان طریقہ بیان فرمایا ہے اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ محبت میں کون سی مشکل ہے۔ پیار میں کون سی دقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمنا تو دل میں پیدا کر لو۔ اس کا خیال لانا شروع کرو دل میں۔ صبح، دوپہر، شام جب بھی خدا تعالیٰ کے احسانات پر نظر کرو جو ہر انسان پر،

بندگی کے ہر ذرے پر، کائنات کے ہر ذرے پر ہیں تو اس کو یاد کرتے ہوئے پھر یہ سوچا کرو کاش ہم بھی وہ ہوتے جو خدا کے مقربین میں شمار ہو سکتے۔ کاش ہم میں بھی قرب الٰہی کی علامتیں ظاہر ہوتیں۔

یہ تمنا پیدا کرنا آپ کا کام ہے پھر اَسْلِمُوْا کا مضمون لازماً اس کے نتیجے میں پیدا ہوگا۔ اگر تمنا سچی تھی، تمنا سچی ہے تو خیال خود بخود ابھرے گا کہ ہم کیسے یہ کام کریں مشکل ہے۔ پھر اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرو، چھوڑ دو اس کے اوپر۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُوَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی صدائیں لگاؤ۔ کہو اللہ ہم چاہتے ہیں کر نہیں سکتے۔ کچھ کر ہمارا، ہماری مدد کو آ، ہمیں سمیٹ لے۔ ہمارا حامی و ناصر ہو جا، ہمارا رفیق ہو جا، ہمارا حفیظ ہو جا۔ یہ دعائیں اس بے اختیاری کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں جو اَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ کے حکم پر عمل کے بعد پیدا ہوا کرتی ہیں، پہلے نہیں ہوا کرتیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو پہلی آیت کریمہ ہے اس سے بہت ہی عظیم عارفانہ مضامین نکالے ہیں اس وقت جتنا سا وقت رہ گیا ہے اس میں چند آپ کے ارشادات میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور خیال یہ ہے کہ شاید بہت سا حصہ بچ جائے گا، بچے گا تو انشاء اللہ آئندہ جمعہ میں میں آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ: **''اے میرے غلامو! جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے''**۔

یعنی اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ تو کہہ کہ اے میرے غلامو! اور ایک جگہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بندوں کا بھی ترجمہ کیا ہے مگر ساتھ تشریح فرما دی ہے کہ کن معنوں میں بندہ ہے یہ۔ مگر پہلے میں نے غلاموں والے اقتباسات لئے ہیں کیونکہ بندے تو خدا کے ہیں سارے۔ بندوں کے معنوں میں تو محمد رسول اللہ ﷺ کا کوئی بندہ نہیں تھا مگر جو محمد رسول اللہ ﷺ کا غلام ہو جائے وہ ایک معنی میں محمد کا بندہ بھی کہلا سکتا ہے **''ہم تو تیرے بندہ بے دام ہیں''** کہتے ہیں جس طرح۔ تو غلام کامل پر لفظ بندہ بھی اطلاق پا جاتا ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں اے محمد ﷺ یعنی نام نہیں لیا مگر مخاطب حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔ **''اے میرے غلامو! جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے کہ تم رحمت الٰہی سے ناامید مت ہو خدا تعالیٰ سارے گناہ بخش دے گا۔''** یہ پہلا آغاز کا اعلان ہے جو اسی طرح میں نے آپ کے سامنے رکھا جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عبارت ہے۔ **''اب اس آیت میں بجائے قل یا عباد اللّٰہ کے**

جس کے یہ معنی ہیں کہ کہہ اے خدا تعالیٰ کے بندو یہ فرمایا قُلْ یٰعِبَادِیَ یعنی کہہ کہ اے میرے غلامو! (یہاں بندہ کی بجائے غلامو کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔) اس طرز کے اختیار کرنے میں بھید یہی ہے کہ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی ہے کہ تا خدا تعالیٰ بے انتہا رحمتوں کی بشارت دیوے''

یہ وہ لطیف معرفت کا نکتہ ہے جو کسی مفسر نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا بیان نہیں کیا۔ فرمایا خود بخود خدا کہہ سکتا تھا اے میرے بندو میں سارے گناہ بخش دوں گا لیکن امید کے لئے کوئی نمونہ تو سامنے ہو۔ بے انتہا رحمتوں کا کوئی نشان تو ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرما رہے ہیں اس وجہ سے محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا تو کہہ دے کیونکہ خدا ان بندوں کو تو اس طرح دکھائی نہیں دے رہا جیسے تو ان کو دکھائی دے رہا ہے اور جو بے چارہ گناہ گار اور ادنیٰ حالتوں میں ہے اس کو ویسے بھی خدا دکھائی نہیں دے سکتا یعنی اپنے نشانات اور اپنی صفات کے ذریعے بھی دکھائی نہیں دیا کرتا لیکن نبی کا وجود ایسا ہے کہ وہ ناممکن ہے کہ نظر نہ آئے۔ اس کا حسن تو اس کے مخالفین، اس کے معاندین کو بھی دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ تو امید کو پوری طرح مستحکم اور قائم کرنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے اعلان کروایا ہے۔ وہ مجسم رحمت سامنے کھڑا تھا، وہ ایسی رحمت تھی جو آنکھوں سے دکھائی دیتی تھی، اندھے بھی جانتے تھے کہ رحمان ہے اور رحیم ہے یعنی خدا کے تابع اس کی صفات رکھنے والا انسان ہے۔ فرمایا:

''بھید یہی ہے کہ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کہ تا خدا تعالیٰ بے انتہا رحمتوں کی بشارت دیوے اور جو لوگ کثرت گناہوں سے دل شکستہ ہیں ان کو تسکین بخشے۔ سو اللہ جل شانہ نے اس آیت میں چاہا کہ اپنی رحمتوں کا ایک نمونہ پیش کرے''۔ (وہ کون سا نمونہ ہے۔) **''اپنی رحمتوں کا ایک نمونہ پیش کرے اور بندہ کو دکھلا دے کہ میں کہاں تک اپنے وفادار بندوں کو انعامات خاصہ سے مشرف کرتا ہوں۔''** اور پھر اس میں جو مضمون حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بیان کے لئے از خود نمایاں کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ بخشش مقصود نہیں ہے۔ بخشش تو ایک منفی صفت ہے صرف، جو گناہ ہو گئے ان سے نظر پھیر لی چلو کچھ نہیں کہتے، سزا نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ صرف اس لئے تو تمہیں اپنی طرف نہیں بلاتا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اعلیٰ مقاصد کے لئے پیدا فرمایا ہے جن میں اس کی رحمت کا نزول ہی ہے جس کی خاطر انسان کو پیدا کیا گیا ہے جو عبادت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ پس یَعْبُدُوْنَ (یونس: 19) کا مضمون بھی یہی

ہے تا کہ تم ان تمام اعلیٰ رحمتوں کو پا جاؤ جن کی خاطر خدا نے تمہیں پیدا فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ کے ذریعے اس اعلان عام کروانے کی یہی حکمت ہے کہ تمہیں پتا چلے کہ یہ آیت اس طرف بلا رہی ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ اے میرے بندو دیکھو تو سہی کہ خدا کتنا رحمان ہے، کتنا رحیم ہے کتنی بخششیں کرنے والا ہے اور میں اس کا نمونہ تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ پس آنحضرت ﷺ اس بات کے نمونہ تو نہیں تھے کہ کثرت سے گناہ نعوذ باللہ من ذالک سرزد ہوتے رہتے تھے اور معافی ہو جاتی تھی۔ نمونہ دیا ہے رحمتوں کی انتہاء کا۔ پس بخشش کے معاملے کو محض پہلی منزل کے طور پر پیش کیا گیا ہے يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا کا جو وعدہ ہے اس میں بخشش کے بعد کے مضمون کی طرف قُلْ يٰعِبَادِيَ کہہ کر توجہ دلا دی گئی۔ بخشش پر راضی نہیں ہونا احسان کی طرف قدم بڑھانا ہے، احسان کی طرف قدم بڑھانا ہے اور اس طرح بڑھانا ہے جس طرح میرے بندے محمد رسول اللہ ﷺ نے قدم بڑھایا ہے، اتنا بڑھانا ہے کہ تم اس کے بندے کہلانے لگو۔ تم اس کے کامل غلام بن جاؤ۔ فرماتے ہیں: ”**سو اس نے قُلْ يٰعِبَادِيَ کے لفظ سے یہ ظاہر کیا کہ دیکھو یہ میرا پیارا رسول ﷺ، دیکھو یہ برگزیدہ بندہ کہ کمال طاعت سے کس درجہ تک پہنچا کہ اب جو کچھ میرا ہے وہ اس کا ہے۔ جو شخص نجات چاہتا ہے وہ اس کا غلام ہو جائے یعنی ایسا اس کی طاعت میں محو ہو جائے کہ گویا اس کا غلام ہے تب وہ گو کیسا ہی پہلے گنہگار تھا بخشا جائے گا۔**“

پس بخشش بھی مشروط ہے آنحضرت ﷺ کی اطاعت کاملہ سے اور یہ اطاعت کاملہ نصیب تو رفتہ رفتہ ہوتی ہے مگر اس کا رجحان جو ہے وہ اَسْلِمُوْا سے بنتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کے سپرد کرے گا وہ اَسْلِمُوْا کے صحیح معنے کا حق ادا کرے گا اور امر واقعہ یہ ہے کہ یہ وہ وجود ہے جس کے ساتھ سپردگی کا رشتہ جو ہے وہ ہر خطرے سے بچا لیتا ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا پیدا نہیں ہوا خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی جس کی حفاظت میں آ کر انسان ہر قسم کے خطرات سے ایسے بچ سکتا ہے جیسے حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی حفاظت میں آنے سے انسان خطرات سے بچتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں: ”**جاننا چاہئے کہ عبد کا لفظ لغت عرب میں غلام کے معنوں پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ (البقرۃ:222)**“ کہ یاد رکھو عبد کا لفظ صرف بندے یعنی خدا کے ان معنوں میں بندے کہ خدا کی تخلیق ہو صرف اس جگہ استعمال نہیں ہوتا بلکہ ایسے شخص کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے

جو عام انسان ہے عبد بمعنی انسان لیکن غلام انسان۔ عبد سے مراد کسی کا بندہ ان معنوں میں نہیں جیسے خدا کی مخلوق ہے۔ انسان تو عام ہے خدا ہی کی مخلوق ہے مگر کسی کا عبد تب بنے گا اگر وہ اس کا غلام ہو جائے، اس کا اپنا کچھ نہ رہے، کلیۃً اس کے آقا کا ہو چکا ہو تو ان معنوں میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ یہ لفظ عبد استعمال ہوا ہے۔

''اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اپنی نجات چاہتا ہے وہ اس نبی سے غلامی کی نسبت پیدا کرے یعنی اس کے حکم سے باہر نہ جائے اور اس کے دامنِ طاعت سے اپنے تئیں وابستہ جانے جیسا کہ غلام جانتا ہے تب وہ نجات پائے گا۔ اس مقام میں ان کور باطن نام کے موحدوں پر افسوس آتا ہے کہ جو ہمارے نبی ﷺ سے یہاں تک بغض رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ نام کہ غلام نبی، غلام رسول، غلام مصطفیٰ، غلام احمد، غلام محمد شرک میں داخل ہیں اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ مدار نجات یہی نام ہیں۔'' بعض ایسے بھی جاہل موحدین کہلاتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ نام ہی مشرکانہ ہیں۔ غلام محمد رسول اللہ ﷺ کا! غلام تو انسان خدا کا ہے صرف۔ وہ جاہل سمجھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں ان کے اس اعتراض کو کلیۃً ہمیشہ کے لئے رد فرما دیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو واضح ہدایت دی جارہی ہے یہ اعلان کر کہ اے میرے بندو یا میرے غلامو!۔ جہاں بندے کا مضمون ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس مضمون کو بھی خوب کھول رہے ہیں یعنی اس معنی کو رد نہیں فرما رہے۔ عام بندوں کو سمجھانے کے لئے فرماتے ہیں اس کا معنی غلام کا بھی ہے اس لئے غلام کے معنوں میں سوچو تو تمہارے دل میں کوئی بھی شرک کا واہمہ پیدا نہیں ہوگا اور اس کی تفسیر فرماتے ہیں، وجہ (بیان) فرماتے ہیں کیوں فرمایا گیا لیکن عبد کا معنی جو بندے کے ہیں اس کا بھی ذکر فرمایا ہے وہ انشاء اللہ بعد میں ان اقتباسات کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھوں گا تو فرمایا یہاں وہ جاہل لوگ ہیں ان کو پتا ہی نہیں کہ غلام جو ہے وہ اپنی شخصیت کو دوسرے کی خاطر کھو دیتا ہے، کلیۃً اس کے تابع فرمان ہو جاتا ہے، اس کا کچھ نہیں رہتا سب کچھ ان کا ہو جاتا ہے۔ ان معنوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کے ہو جاؤ تو پھر نجات یقینی ہے۔ کوئی بھی نجات کی راہ میں تمہارے لئے روک پیدا نہیں ہوگی۔ کسی طرف سے بھی نجات کو کوئی بھی خطرہ نہیں پیدا ہوگا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن میں، اس کی پناہ میں آجاؤ تو ساری پناہیں تمہیں مل جائیں گی۔

پھر فرماتے ہیں: ''**اور چونکہ عبد کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ ہر ایک آزادگی اور خودروی سے باہر آ جائے اور پورا متبع اپنے مولیٰ کا ہو اس لئے حق کے طالبوں کو یہ رغبت دی گئی کہ اگر نجات چاہتے ہیں تو یہ مفہوم اپنے اندر پیدا کریں**''۔ (اب اس مفہوم میں داخل ہو کر کوئی بہت بڑا ایک ذمہ داری کا مقام آنکھوں کے سامنے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں اپنی ہر آزادی کو محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ڈال کے اس آزادی سے فارغ ہو جاؤ۔ ہر خودروی سے باہر آ جاؤ۔ اپنی مرضی کرنے کے جو رجحانات پائے جاتے ہیں یہاں تو ہم اپنی کریں گے، ان سب سے ان کے دائروں سے باہر آ جاؤ) ''**اور پورا متبع اپنے مولیٰ کا ہو**'' (**یعنی محمد رسول اللہ ﷺ ان معنوں میں تمہارے مولیٰ ہوں کہ ان کی کامل اطاعت کے دائرے میں داخل ہو۔**) **اس لئے حق کے طالبوں کو یہ رغبت دی گئی کہ اگر نجات چاہتے ہیں تو یہ مفہوم اپنے اندر پیدا کریں**''۔ (آئینہ کمالات السلام۔ روحانی خزائن جلد 5 صفحہ: 190 تا 192)

پس میں امید رکھتا ہوں کہ ان آیات کریمہ کی اس تفسیر سے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقتباسات کے حوالے سے میں نے کی ہے آپ استفادہ کریں گے اور توجہ کریں گے۔ اپنے چھوٹے بچوں کو بھی متوجہ کریں۔ انابت کا جو معاملہ ہے وہ بچپن سے ہی شروع ہونا چاہئے۔ وہ سب بڑے یا بڈھے بھی کہہ دینا چاہئے جن کے دل میں بچپن میں کوئی رمق، اللہ کی محبت کی تھی بچپن میں خیال آیا کرتا تھا کہ ہم اللہ والے ہوں ان کو اللہ تعالیٰ گھیر گھار کے لے آیا کرتا ہے ان میں سے کسی کا بدانجام میں نے نہیں دیکھا۔ بدیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود پھر آخر ان کی آخری منزل وہی ہوتی ہے جو خدا کی اطاعت کی منزل ہے۔ تو اپنے بچوں پر رحم فرمائیں۔ ان کو بچپن ہی سے انابت کا مضمون سکھائیں اور جو بے راہرو ہیں ان کو سختی سے مشکل مقامات کی طرف بلانے کی بجائے انابت کے ذریعے ان کے دل میں داخل ہوں اس کے لئے ہر دروازہ کھلا رہتا ہے۔ کوئی خدا کے لئے کبھی تو اللہ کی سوچا کرو، کبھی تو اس کی طرف جھکنے کی توجہ پیدا کرو کبھی تو اس کی طرف مائل ہوا کرو۔ یہ آواز جو ہے شاذ ہی کوئی بد بخت ہے جو اس کو رد کرے۔ تو اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ ہمیں ان معنوں میں اس رمضان کی خیر و برکت کو اپنے لئے دائمی کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین